

امام حسین علیہ السلام اور تقیہ

<"xml encoding="UTF-8?">

سوال علم کی کلید ہے، انسان کی خلقت کے آغاز سے ہی سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اگر سوال نہ ہوتا تو علم بھی نہ ہوتا سوال ہی کے ذریعے علم و آگہی کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے اور علم کے بند دروازے کھلتے ہیں اور انسان اپنے سوالات اور تجسس کے ذریعے علم کی منزلیں طے کرتا ہے۔ کسی واقعہ اور تاریخی حادثے کے بارے میں سوالات ہر متجسس ذہن میں ہوتے ہیں اور وہ تاریخ کے اس اہم ترین واقعے کی تمام جزئیات تک پہنچ کر اس واقعے کی حق و باطل قوتوں کی پہچان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تاریخ اسلام بلکہ تاریخ انسانیت کا اہم ترین واقعہ، قیام کربلا ہے کہ جس میں سلسلہ نبوت و رسالت کے آخری تاجدار جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے اور آدم (ع) سے لیکر خاتم (ص) کی نبوت کے امین، نظام امامت و ولایت کے تیسرے تاجدار نے حق و باطل کے اس معرکے میں شریعت کی پاسداری کے لئے اور دین اسلام کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی قربانی دی اور تمام مسلمانوں اور حق کے پیرو کاروں کے لئے ظلم و ستم کے خلاف قیام کرنے کا راستہ ہموار کر دیا اور مظلوموں کو جرائت عطا کی کہ وہ ظالموں کے ظلم و استبداد کے سامنے کبھی بھی سر نہ جھکائیں۔ قیام امام حسین (ع) در حقیقت پاسداری شریعت کا نام ہے اور شرعی اصولوں کی حکمرانی اور غیر شرعی زندگی کے خاتمے کا اعلان ہے اس لئے میدان کر بلا میں امام عالی مقام کا ہر قدم اور ہر عمل شریعت اسلامیہ کے احیاء کے لئے اُٹھ رہا ہے اور انسانی عقل و منطق کے عین مطابق تھا۔ اس لئے امامت و ولایت کی معرفت رکھنے والا کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا کہ امام حسین علیہ السلام نے کوئی قدم شریعت کے خلاف اٹھایا ہے اور اپنے جذبات و احساسات سے متاثر ہو کر یزید کے خلاف جنگ لڑی ہے۔ یہ بات وہی ذہن سوچ سکتا ہے جو امام عالی مقام (ع) کی عصمت اور ولایت کا قائل نہیں اور امام علیہ السلام کو ایک عام لیڈر یا عرب سردار کے طور پر پہنچانتا ہے اور یزید و امام حسین (ع) کے معرکے کو دو شہزادوں کی جنگ سمجھتا ہے۔ لیکن امام حسین (ع) کے دین اسلام میں مقام و منزلت اور رسول اکرم (ص) کی جانب سے امام علیہ السلام کی جو معرفت کرائی گئی ہے اس سے آشنا انسان کبھی بھی اس طرح کی سوچ نہیں رکھ سکتا۔ لیکن سوال و شبہ خواہ معاند کی جانب سے ہو یا دوست کی جانب سے ہو اگر وہ حل ہو جائے اور علم کے دروازے کھول دے تو علم کی کلید ہے۔ اس لئے یہاں قیام امام عالی مقام (ع) کے بارے میں ایک اہم سوال پیش کیا جاتا ہے اور تاریخ اور عقل و شریعت کی روشنی میں اُس کا جواب تلاش کیا جاتا ہے تا کہ معرفت امام (ع) میں اضافہ ہو سکے اور قیام امام (ع) کے مقاصد سے آگاہی حاصل کی جاسکے۔

وہ سوال یہ ہے کہ اگر ہم تمام انبیاء اور اولیاء اور معصومین علیہم السلام کی جہد مسلسل پر مشتمل زندگی کو دیکھیں تو ہم ایک چیز بہت واضح نظر آتی ہے اور وہ ہے خطرات کے مقابلے میں تقیہ کی حکمت عملی کہ جو شریعت میں حکم ثانوی کے طور پر جائز قرار دی گئی ہے۔ انبیاء اور ائمہ اطہار (ع) کی سیرت اور تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ ان ذوات مقدسہ نے ضرورت کے وقت اس حکمت عملی سے استفادہ کیا ہے اور اپنے پیرو کاروں کو بھی تقیہ کا حکم دیا ہے۔ اگر تقیہ ایک شرعی رخصت ہے اور اس کا جواز روایات میں موجود ہے تو سیدالشہدا علیہ السلام نے تقیہ کا راستہ کیوں نہیں اختیار کیا؟ اور اس شرعی رخصت سے استفادہ کرتے ہوئے عالم اسلام کو کر بلا جیسے افسوس ناک واقعہ سے کیوں نہیں بچایا؟ کیا امام حسین تقیہ نہیں کر سکتے تھے

یا وہ تقیہ کے قائل نہیں تھے ؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جو دینی معرفت سے عاری اذہان میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے پہلے خود شریعت میں تقیہ کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے لہذا تمہید کے طور پر تقیہ کے بارے میں چند ضروری باتیں یہاں پیش کی جاتی ہیں اور پھر ان کی روشنی میں معرکہ کر بلا میں امام حسین (ع) کے تقیہ نہ کرنے کی وجوہات پیش کی جائیں گی۔

تقیہ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

سب سے پہلے تقیہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کیا جاتا ہے۔ لغت میں تقیہ مادہ ”وَقَى، يَقِي“ اور ”اتَّقَى، يَتَّقِي“ سے مصدر ہے۔ ابعض نے اسے اسم مصدر کہا ہے۔ ۲ یہاں ”واو“، ”تاء“ میں بدل گیا ہے۔ اس مادہ کے تحت جو بھی کلمات آئے ہیں انکا معنی، حفاظت کرنا، بچانا، پرہیز کرنا اور امور کی اصلاح کرنا ہے۔ قرآن کریم میں بھی ”وَقَى“ حفاظت اور بچانے کے معنی میں آیا ہے: ”فَوَقَاهُ اللَّهُ سَيِّئَاتٍ مَّامَكْرُؤًا“ ۳ یعنی: خداوند متعال نے اس (موسیٰ ع) کو ان برائیوں سے بچایا (کہ جو آل فرعون نے اس کے بارے میں سوچ رکھی تھیں)۔

ثِقَاةٌ، تَقِيَّةٌ، تَقْوَىٰ و اتَّقَاءٌ، سب ایک ہی (مادہ سے) ہیں۔ اسی لئے بعض قرآنی قرائتوں کے مطابق آیہ مبارکہ: ”إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً“ ۴ میں ”تُقَاةً“ کی جگہ ”تَقِيَّةً“ پڑھا گیا ہے۔ ۵

تقیہ کا اصطلاحی معنی بیان کرنے کیلئے بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ ان میں سے اکثر تعاریف ”جامع افراد اور مانع اغیار“ نہیں، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی تقیہ کی حقیقی تعریف نہیں بلکہ ”شرح الاسمی“ تعریف ہے۔ لہذا ان پر جامع و مانع تعریف نہ ہونے کا اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں بطور نمونہ بعض علماء سے منقول تقیہ کی چند تعریفیں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ شیخ مفید (رہ) تقیہ کا اصطلاحی معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (التَّقِيَّةُ كَتِمَانِ الْحَقِّ وَ سِتْرِ الْإِعْتِقَادِ فِيهِ وَمَكَاتِمَةِ الْمَخَالِفِينَ وَ تَرْكِ مَظَاهِرَتِهِمْ بِمَا يَعْقِبُ ضَرَرًا فِي الدِّينِ أَوْ الدُّنْيَا) ۶ یعنی: ”حق کو پوشیدہ رکھنا اور عقیدہ حق کو مخالفین سے چھپانا اور جن چیزوں کے اظہار سے دینی و دنیوی نقصان کا اندیشہ ہو ان کو ظاہر کرنے سے پرہیز کرنا، تقیہ کہلاتا ہے۔“

۲۔ شیخ مرتضیٰ انصاری (رہ) فرماتے ہیں: (وَالْمُرَادُ هُنَا التَّحْفِظُ عَنْ ضَرَرِ الْغَيْرِ بِمُوَافَقَتِهِ فِي قَوْلِ أَوْ فَعَلٍ مُخَالَفٍ لِلْحَقِّ) یعنی: ”یہاں تقیہ سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کے مخالف حق، قول و فعل کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے ان کی طرف سے (متوقع) ضرر و نقصان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا۔“ ۷

۳۔ علامہ طبرسی (رہ) لکھتے ہیں: (وَالْتَقِيَّةُ الْأُظْهَارُ بِاللِّسَانِ خِلَافَ مَا يَنْطَوِي عَلَيْهِ الْقَلْبُ لِلْخَوْفِ عَلَى النَّفْسِ) یعنی: ”اپنی جان کے خوف سے جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف زبان سے اظہار کرنے کو تقیہ کہتے ہیں۔“ ۸

۴۔ شیخ طوسی (رہ) تقیہ کی اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (التَّقِيَّةُ: الْإِظْهَارُ بِاللِّسَانِ خِلَافَ مَا يَنْطَوِي عَلَيْهِ الْقَلْبُ لِلْخَوْفِ عَلَى النَّفْسِ إِذَا كَانَ مَبِطْنَةً هُوَ الْحَقُّ) یعنی: ”اپنی جان کے خوف سے جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف اظہار کرنے کا نام تقیہ ہے البتہ اس شرط کے ساتھ کہ جو دل میں ہو، وہ حق بات ہو (نہ کہ خلاف حق)۔“ ۹

۵۔ آیت اللہ بروجردی (رہ) لکھتے ہیں: (بِحِفْظِ الشَّخْصِ عَقِيدَتَهُ مِنْ جِهَةِ حِفْظِ الْأَمْرِ الْأَهَمِّ) یعنی: ”کسی شخص کا اپنے عقیدے (اور نظریے) کو کسی اہم و نہایت ضروری امر کی خاطر چھپانا (محفوظ رکھنا) تقیہ کہلاتا ہے۔“ ۱۰

یہاں ہم نے علماء، فقہاء اور مفسرین میں سے چند برجستہ شخصیات کے اقوال نقل کیئے ہیں کہ جنہوں نے اپنے اپنے الفاظ میں تقیہ کی تعریف کی ہے اور اصطلاحی معنی بیان کیا ہے۔ مذکورہ تعریفوں میں سے بعض کا دائرہ وسیع ہے اور بعض کا دائرہ تنگ ہے اور بہت سے ایسے اقوال و افعال کو شامل نہیں جو تقیہ کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ مثلاً جس تعریف میں فقط باطنی معتقدات کے برخلاف زبانی اظہار کو تقیہ کہا گیا ہے وہ ان افعال کو شامل نہیں کہ جو انسان اپنے اعضائے جوارح سے باطنی اعتقاد کے خلاف انجام دیتا ہے جیسے نماز میں تقیہ کہ جو زبان کے علاوہ انسانی اعضاء و جوارح کے ذریعے اظہار عمل کا نتیجہ ہے۔ لہذا اس اعتراض سے بچنے کیلئے ہم اس تعریف کو وسعت دیتے ہوئے کہہ سکتے ہیں: (التَّقِيَّةُ هِيَ الْإِظْهَارُ بِاللِّسَانِ أَوْ بِسَائِرِ الْأَعْضَاءِ) کیونکہ تقیہ کے اکثر موارد ایسے اعمال میں پیش آتے ہیں کہ جو انسانی اعضاء و جوارح سے انجام پاتے ہیں۔

ان تعریفوں میں سے بعض نے فقط ”خوف علی النفس“ کی قید لگائی ہے لیکن ضروری نہیں تقیہ فقط جان کے تحفظ ہی کے لئے انجام پائے بلکہ عزت و ناموس، مال و دولت اور دینی و سیاسی اور اجتماعی مصلحتوں کی خاطر بھی تقیہ کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ بہت سی روایات و احادیث میں مذکورہ مصلحتوں کی خاطر بھی تقیہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ البتہ اجتماعی و دینی اور سیاسی مصلحتوں کو ”اولویت“ کے عنوان سے اس تعریف میں داخل کیا جاسکتا ہے۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ”جب تقیہ جان و نفس کی خاطر ضروری ہے تو عام مؤمنین کو ضرور نقصان سے بچنے اور اسلامی معاشرے و حکومت کی مصلحتوں کی خاطر بطریق اولیٰ لازمی ہوگا۔“ اس طرح عزت و ناموس اور مال و دولت کو بھی اس تعریف میں داخل کیا جاسکتا ہے اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ: ”قدر و منزلت اور حرمت کے لحاظ سے مؤمن کی عزت و آبرو اور مال و دولت اس کے نفس کی مانند ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: قَالَ النَّبِيُّ (ص): (حَرَمَةُ مَالِ الْمُسْلِمِ كَحَرَمَةِ دَمِهِ) ”مسلمان کے مال کی حرمت، اس کے خون کی حرمت کی مانند ہے۔“ ۱۱ البتہ ان تمام اصطلاحی معنوں اور تعریفات کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض نے ایک جامع تعریف کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ ایک تعریف میں تقیہ کا یہ مفہوم پیش کیا گیا ہے:

”بعض احکام شرع کو دینی مصالح اور دوسرے اسلامی فرقوں اور مذاہب کے ساتھ مدارا کرنے کی خاطر ترک کرنا تقیہ کہلاتا ہے، اس شرط کے ساتھ (کہ اس ترک کرنے میں) کوئی غرض عقلائی موجود ہو یا جان و مال و عزت و ناموس کا خوف ہو۔“ ۱۲

چند نکات تقیہ کے اصطلاحی مفہوم سے متعلق

مذکورہ بالا تمام تعریفوں کے مطالعے سے چند نکات سامنے آتے ہیں جن کی طرف توجہ کرنے سے ہمیں تقیہ کا ایک جامع مفہوم مل سکتا ہے۔ وہ نکات یہ ہیں:

- ۱۔ عقیدہ حقہ کو مخفی اور پوشیدہ رکھنا تقیہ کا ایک اہم رکن ہے۔ ۲۔ مخالفین حق کے ساتھ موافقت و ہم آہنگی کرنا، تقیہ کا ایک دوسرا رکن ہے۔ ۳۔ حق کا یہ اخفاء اور باطل کا مظاہر یا توجان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کیلئے ہے یا دینی و اجتماعی و سیاسی مصالح اور عام مؤمنین کو ضرور زیاں سے محفوظ رکھنے کی خاطر ہے۔ پس کسی دینی عقیدے کو ضرر و نقصان کے خوف سے مخفی کرنے کا نام اسی وقت تقیہ ہوگا جب وہ حق پر مبنی ہوگا۔ خلاف حق نظریے و عقیدے کو مخفی کرنا تقیہ نہیں کہلاتا۔ ۴۔ تقیہ کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک سلبی پہلو اور دوسرا ایجابی پہلو۔ حق کا کتمان اور حق کو پوشیدہ رکھنا، سلبی پہلو اور مخالفین حق کے ساتھ موافقت و قدم بہ قدم چلنا، تقیہ

کایجابی پہلو ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کی علت ایک ہی ہے اور وہ ضرور نقصان سے بچنا ہے، ضرر خواہ جانی ہویا مالی، عزت و ناموس کا ضرر ہویا اجتماعی و سیاسی۔ ۵۔ تقیہ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اپنی قوت کو دشمن کے مقابلے کے لئے محفوظ رکھ کر اسے بلا مقصد ضائع ہونے سے بچایا جائے تاکہ دینی و اجتماعی اہداف اور مصلحت عامہ کی خاطر اس ذخیرہ شدہ قوت سے ہر وقت استفادہ کیا جاسکے۔ ۶۔ آیت اللہ بروجردی (رہ) کی تعریف میں کسی اہم و ضروری امر کی خاطر اپنے عقیدے و نظریے کے کتمان کو تقیہ کہا گیا ہے۔ اس تعریف میں جو چیز مدنظر رکھی گئی وہ تقیہ کا فلسفہ ہے یعنی ایک عمیق جدوجہد کیلئے آمادہ ہونا اور اپنی قوت کو اجتماعی زندگی کے اہم ترین مقاصد کیلئے استعمال کرنا، تقیہ کہلاتا ہے۔ پس تقیہ تدبیر اور حکمت عملی ہے جس کے ذریعے انسان کو نظم و انضباط کیساتھ نظریاتی جدوجہد اور مبارزے کیلئے تیار کیا جاتا ہے۔ ۷۔ تقیہ ہر اس قوم و جماعت کیلئے ایک ڈھال و سپر ہے جس پر اکثریت کا غلبہ ہو اور وہ اکثریت، اس اقلیت کو اظہار عقیدہ اور اس کے مطابق عمل کرنے کی اجازت نہ دیتی ہو تو وہ اقلیت عقلی و شرعی رخصت سے استفادہ کرتے ہوئے فطرت انسانی کے عین مطابق اہم ترین مقاصد کی خاطر تقیہ کا سہارا لیتی ہے۔

تقیہ، حکم اولی یا حکم ثانوی

اصول فقہ میں احکام شرعیہ کو چند قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ منجملہ احکام کو احکام اولیہ اور احکام ثانویہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہاں ان احکام کی تفصیلی بحث مقصود نہیں ہے فقط موضوع کی مناسبت سے ان احکام کی طرف ایک اشارہ کرتے ہوئے یہ دیکھنا ہے کہ آیا تقیہ حکم اولیٰ ہے یا حکم ثانوی؟ جس کے لیے حکم اولیٰ و حکم ثانوی کی اصطلاحی معنی بیان کرنا ضروری ہے۔

حکم اولیٰ اور حکم ثانوی کی گونا گوں تعریفیں کی گئی ہیں۔ یہاں پیچیدہ اصطلاحی تعریفوں سے بچتے ہوئے ہم سادہ الفاظ میں وہ تعریف نقل کرتے ہیں کہ جو فقہاء کے درمیان مشہور ہے۔

حکم اولیٰ: ایسا حکم کہ جو افعال و ذوات کے عناوین اولیہ کے لحاظ سے ان پر حمل ہوتا ہے۔ جیسے صبح کی نماز کا واجب ہونا، شراب کا حرام ہونا وغیرہ۔

حکم ثانوی: ایسا حکم کہ جو کسی موضوع پر اضطرار، اکراہ اور دوسرے عارضی عناوین کو مدنظر رکھتے ہوئے حمل ہوتا ہے۔ جیسے ماہ رمضان المبارک میں بیمار کے لیے افطار کا جائز ہونا یا بیمار کے لیے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا جائز ہونا۔ ۱۳ یاد رہے کہ اسے حکم ثانوی اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ حکم اولیٰ کے طول میں واقع ہوتا ہے یعنی پہلے حکم اولیٰ ہے اگر اس پر عمل نہ کیا جاسکے تو حکم ثانوی ہے۔

تقیہ اور دوسرے احکام ثانویہ میں ارتباط

گوکہ تقیہ خود حکم ثانوی ہے لیکن تقیہ کا بعض دوسرے احکام ثانویہ کے ساتھ گہرا ربط موجود ہے۔ ۱۴ چونکہ بہت سے موارد میں تقیہ کے جواز کا ملاک و معیار اضطرار ہے۔ جیسا کہ روایت میں ہے: التقیۃ فی کل شئی یضطرر لہ ابن آدم ۱۵ ”تقیہ ہر اس چیز میں ہے کہ جس میں انسان مضطر ہو جائے“۔ اسی طرح بعض مقامات پر تقیہ عسرو حرج کی وجہ سے جائز ہوتا ہے۔ بعض موارد میں ”اکراہ“ کو بھی تقیہ کے جواز کا باعث قرار دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ تقیہ کی قرآنی ادلہ میں سے سورہ نحل کی آیت ۱۰۶ میں تقیہ کی علت اکراہ کو قرار دیا گیا ہے۔

تقیہ کی ایک دوسری تقسیم:

فقہائے امامیہ نے تقیہ کے احکام تکلیفی بیان کرتے ہوئے اسے بھی دوسرے افعال کی مانند احکام خمسہ میں تقسیم کیا ہے چنانچہ شہید اول (رہ) اور استاد الفقہاء شیخ انصاری (رہ) نے تقیہ کے احکام خمسہ اس ترتیب سے بیان فرمائے ہیں:

۱۔ تقیہ واجب:

جب دفع ضرر بالفعل واجب ہو ۱۶ اور انسان جان لے کہ تقیہ نہ کرنے کی وجہ سے اسے یا کسی مؤمن کو ضرر پہنچے گا تو تقیہ واجب ہوگا ۱۷۔ انسان کسی ایسے ماحول میں زندگی گزار رہا ہو کہ جہاں اظہار اسلام کرنے یا اہل بیت اطہار (ع) سے اظہار مودت کرنے سے جان کا خطرہ ہو یا کسی حاکم جائز کے سامنے کوئی بات کہنے سے کسی مؤمن کی جان خطرے میں پڑ جائے تو یہاں تقیہ اور کتمان حق واجب ہو جاتا ہے۔

۲۔ تقیہ مستحب:

جب تقیہ نہ کرنے کی وجہ سے طرف مقابل کی جانب سے تدریجاً ضرر پہنچنے کا احتمال ہو تو تقیہ مستحب ہے۔ دوسرے الفاظ میں اپنے آپ کو خطرے سے دور رکھنے کے لیے تقیہ کرنا مستحب ہے۔ مثلاً مخالفین کے ساتھ ان کی اکثریت کے علاقے میں زندگی گزارنے کے باوجود مدارانہ کرنا، تدریجی طور پر ان میں نفرت پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے جس سے مستقبل میں خطرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہاں تقیہ کرنا مستحب ہوگا یا کسی مستحب امر میں تقیہ کیا جائے جیسے تسبیحات حضرت زہرا (س) کی ترتیب میں تقیہ کرنا یا اذان کی بعض فصول (مثلاً حی علی خیر العمل) میں تقیہ کرنا وغیرہ ۱۸۔

۳۔ تقیہ مکروہ:

جہاں تقیہ نہ کرنا اور ضرر برداشت کرنا، تقیہ کرنے سے بہتر ہو۔ مثلاً کسی قوم کے رئیس و سردار کے تقیہ کرنے کی وجہ سے اس کے پیروکاروں میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگیں اور وہ گمان کریں کہ حکم واقعی ویسے ہے جیسے اس نے انجام دیا ہے۔ تو یہاں لوگوں کو گمراہی و سرگردانی سے بچانے کے لئے تقیہ نہ کرنا بہتر ہے۔

۴۔ تقیہ حرام:

جب تقیہ کرنے کی وجہ سے کسی مؤمن کا خون بہے جانے کا اندیشہ ہو تو وہاں تقیہ حرام ہے (۷) البتہ تقیہ حرام کی تفصیل ”مستثنیات تقیہ“ میں پیش کی جائیگی۔

۵۔ تقیہ مباح: جب تقیہ کرنے اور نہ کرنے میں کوئی فرق نہ ہو اور انسان دونوں کے انجام دینے میں مخیر ہو۔ مثلاً پیغمبر اسلام (ص) کے زمانے میں جب ”مسیلۃ کذاب“ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو دو مسلمانوں کو اس کے ساتھیوں نے پکڑ لیا اور ان سے کہا کہ وہ مسیلۃ کذاب کے نبی ہونے کی گواہی دیں۔ ان دونوں میں سے ایک نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے نبی ہیں اور مسیلۃ جھوٹا ہے۔ مسیلۃ نے اسے قتل کر دیا۔ دوسرے مسلمان نے مسیلۃ کے کہنے پر عمل کیا اور اس کے نبی ہونے کی گواہی دے دی۔ مسیلۃ نے اسے آزاد کر دیا۔ جب یہ خبر پیغمبر اسلام (ص) تک پہنچی تو آپ (ص) نے فرمایا:

”پہلا شخص کہ جس نے اقرار نہیں کیا اور قتل ہو گیا وہ بہشت کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ دوسرا شخص کہ جس نے اپنے فریضہ پر عمل کیا اور تقیہ اختیار کر کے محفوظ ہو گیا ہے۔ لہذا ہر دو مأجور ہیں۔“ یعنی تقیہ مباح کی صورت میں تقیہ کرنے والا اور نہ کرنے والا ہر دو مأجور و مثاب ہوتے ہیں ۱۹۔

امام خمینی (رہ) کے نزدیک تقیہ کی اقسام م: تقیہ کو مختلف لحاظ سے چند اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جتنے بھی محققین اور علماء نے تقیہ کے بارے میں کچھ لکھا ہے ان میں سے کسی نے بھی تقیہ کی اقسام اتنی دقت سے بیان نہیں کیں جتنی دقت اور باریک بینی سے امام خمینی علیہ الرحمہ نے بیان کی ہیں۔ امام امت (رہ) نے تقیہ کو مختلف لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

(الف) تقیہ کی ذاتی تقسیم:

تقیہ ذاتی طور پر چند قسموں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اسے ہم اسباب کے لحاظ سے بھی تقیہ کی تقسیم کہہ سکتے ہیں۔ یعنی تقیہ کرنے کا سبب کیا ہے۔

۱۔ تقیہ خوفیہ:

کسی خوف اور خطرے کے سبب تقیہ کرنا، تقیہ خوفیہ کہلاتا ہے۔ اسے ہم تقیہ اکراہیہ بھی کہہ سکتے ہیں یعنی جبر و اکراہ کی وجہ سے تقیہ کرنا۔ یہاں خوف و خطرہ بھی تین طرح کا ہو سکتا ہے۔

(۱) اپنی جان و مال یا عزت و آبرو کے خطرے و خوف کی وجہ سے تقیہ کرنا۔ (۲) دوسرے مؤمنین کو ضرر پہنچنے کے خطرے و خوف کے سبب تقیہ کرنا۔ (۳) دنیائے اسلام یا اسلامی معاشرے کو (ناقابل تلافی) ضرر و نقصان پہنچنے کے خطرے و خوف کے سبب تقیہ کرنا۔

خوف و خطریا جبر و اکراہ کی بناء پر تقیہ کرنے کی طرف آیات و روایات میں بھی واضح اشارہ ملتا ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران کی آیت ۲۸ ”لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْخ“ تقیہ خوفیہ ہی کی طرف ناظر ہے۔ اسی طرح سورہ نحل کی آیت ۱۰۶ ”وَمَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ اٰيْمَانِهٖ اِلَّا مَنْ اَكْرَهَ... الْخ“ بھی جبر و اکراہ کی بناء پر تقیہ کرنے کے جواز پر دلالت کر رہی ہے۔ بعض روایات و احادیث میں بھی جان و مال اور عزت و آبرو کے خوف کی وجہ سے تقیہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ جیسا کہ امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی ایک حدیث گذشتہ صفحات میں نقل کی گئی ہے جس میں آپ (ع) فرماتے ہیں:

”تقیہ مؤمن کے بہترین اعمال میں سے ہے جس کے ذریعے وہ اپنے آپ کو اور اپنے دینی بھائیوں کو ظالموں سے بچاتا ہے۔۔۔“ ۲۰۔ اسی طرح دوسری بہت سی روایات میں بھی تقیہ کا سبب خوف و خطر کو قرار دیا گیا ہے اور اس کی بناء پر تقیہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ چند روایات ادلہ تقیہ کے ذیل میں نقل کی گئی ہیں۔

تقیہ خوفیہ کی تیسری قسم وہ تقیہ ہے کہ جو دنیائے اسلام و اسلامی معاشرے کو ناقابل تلافی نقصان و ضرر سے بچنے کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تقیہ فقط جان و مال کی حفاظت اور خطرے سے بچنے ہی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ ان چیزوں سے بھی زیادہ اہم مقصد کے لیے تقیہ کیا جاتا ہے اور وہ اہم مقصد دین اسلام اور مذہب حقہ کی حفاظت اور اسے دشمنوں کے خطرے سے محفوظ رکھنا ہے۔ امام خمینی (رہ) تقیہ کی اس قسم کو اذاعہ و افشاء کے مقابلے میں بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں: (ومنها: ماتکون واجبة لنفسها، وهي ماتکون مقابلة للإذاعه، فتکون بمعنی التحفظ عن إفشاء المذهب وعن إفشاء سرائل البيت

۔ فی نظرہم کثیر من الروایات أن التقیة التي بالغ الأئمة (ع) فی شانها، هی هذه التقیة فنفس إخفاء الحق فی دولة الباطل واجب وتكون المصلحة فيه جهات سياسية دينية ولولا التقیة لصار المذهب فی معرض الزوال والانقراض) ۲۱

”تقیہ کی ایک قسم وہ ہے کہ جو ذاتاً واجب ہے اور یہ وہ تقیہ ہے جو ذاعہ و افشا کے مقابلے میں ہے ۔ پس اس کا معنی مذهب حقہ کو افشاء ہونے سے محفوظ رکھنا اور اہل بیت (ع) کے اسرار کو آشکار نہ کرنا ہے۔ بہت سی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آئمہ اہل بیت (ع) جس تقیہ کی تاکید فرماتے تھے وہ یہی تقیہ تھا۔ بنا براین باطل حکومت کے دوران حق کو پنهان رکھنا واجب ہے اور اس اخفاء و پوشیدگی حق کی مصلحت اس کا دینی و سیاسی پہلو ہے۔ اگر تقیہ نہ ہوتا تو مذهب حقہ زوال و انقراض کے خطرے سے دوچار ہوجاتا۔“

پس جان و مال اور عزت و آبرو کے علاوہ دین اسلام اور مذهب حقہ کی حفاظت جیسے اہم مقصد کی خاطر تقیہ کرنا واجب ہے۔ اگر دین اور مذهب خطرے سے دوچار ہوجائے اور ہمارا تقیہ کرنا اسے بچا سکتا ہو تو تقیہ کرنا واجب ہوجاتا ہے جیسا کہ سیرت آئمہ اطہار (ع) خصوصاً امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی مقدس زندگی اس کی شاہد ہے کہ آپ (ع) نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ دین اسلام اور مذهب حقہ کی مصلحت و حفاظت کی خاطر تقیہ میں گزارا۔

تقیہ مدارا تہ:

دین اسلام میں دوسروں کے ساتھ صلح و آشتی اور مدارا کرنے کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ تقیہ مدارا تہ یہ ہے کہ وحدت مسلمین کی خاطر مخالف مذهب مسلمان بھائیوں کے ساتھ صلح و آشتی اور مدارا کرتے ہوئے ایسا کوئی عمل انجام نہ دینا جو ان کی دل شکنی اور نفرت کا باعث بنے، بلکہ چھوٹے موٹے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر دوسرے مسلمانوں کی محبت و موڈت حاصل کرنا چاہیئے۔ تقیہ مدارا تہ میں ضرور نقصان کا خوف نہیں ہوتا بلکہ فقط مسلمانوں کے اتحاد اور باہمی اخوت و محبت کو برقرار کرنا ہی اس قسم کے تقیہ کا مقصد ہے۔ تقیہ مدارا تہ کے بارے میں بہت سی احادیث و روایات ملتی ہیں اور آئمہ طاہرین (ع) کی طرف سے اس سلسلے میں خصوصی تعلیمات ملتی ہیں؛ چند روایات ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ (عن عبد اللہ بن سنان، عن أبی عبد اللہ علیہ السلام قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ: أمرنی ربی بمداراة الناس كما أمرنی بأداء الفرائض) ۲۲

”عبد اللہ بن سنان امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا (ص) نے فرمایا: میرے پروردگار نے مجھے جیسے واجبات و فرائض کی انجام دہی کا حکم دیا ہے ویسے ہی لوگوں کے ساتھ مدارا اور آشتی کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔“

۲۔ (عن أبی عبد اللہ علیہ السلام قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ: مداراة الناس نصف الإیمان والرفق بهم نصف العیش) ۲۳

’امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ رسول خدا (ص) نے فرمایا: لوگوں کے ساتھ آشتی و مدارا نصف ایمان ہے اور ان سے نرمی و مہربانی کرنا نصف زندگی ہے۔“

۳۔ (عن أبی عبد اللہ علیہ السلام فی رسالته إلی أصحابه قال: وَعَکِّمُ بِمُجَامَلَةِ أَهْلِ الْبَاطِلِ.....) ۲۴

”حضرت جعفر صادق علیہ السلام اپنے اصحاب کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں: تمہارے لیے اہل باطل کے ساتھ خوش رفتاری و خوش کلامی کرنا ضروری ہے۔“

آئمہ معصومین علیہ السلام کی طرف سے مخالف مذہب کے دینی بھائیوں اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حسن معاشرت اور مدارا و آشتی کی اس قدر تاکید کا فلسفہ درحقیقت قرآن کے اس فرمان کی تعمیل ہے کہ جس میں خداوند متعال مسلمانوں کو تفرقہ سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ خداوند فرماتا ہے:

(وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا... ۲۵)

”تم سب لوگ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور متفرق نہ ہو اور یاد کرتے رہو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو تم پر ہے جبکہ تم دشمن تھے۔ پس اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی تم اس نعمت کے طفیل بھائی بھائی ہو گئے۔“

متقی (تقیہ کنندہ) کے لحاظ سے تقیہ کی اقسام

- ۱۔ عام انسانوں کا تقیہ: معاشرے کے عام لوگوں کا تقیہ کرنا کہ جو کسی مقام و عہدے پر فائز نہیں۔
- ۲۔ معاشرے کے دینی و غیر دینی رہنماؤں کا تقیہ: ان لوگوں کا تقیہ کرنا کہ جو دینی یا دنیوی لحاظ سے لوگوں کے درمیان کسی مقام و حیثیت کے حامل افراد ہیں مثلاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تقیہ کرنا (اگر نبی ص) کے لیے تقیہ کرنا جائز ہو یا آئمہ طاہرین علیہ السلام، فقہا، رؤسائے مذہب اور سلاطین و حکام کا تقیہ کرنا۔ ان میں سے ہر ایک کے تقیہ کے بارے میں جداگانہ بحث کی ضرورت ہے۔
- (د) متقی منہ (جس سے تقیہ کیا جاتا ہے) کے لحاظ سے تقیہ کی اقسام
 - ۱۔ کفار و مشرکین سے تقیہ کرنا، خواہ وہ حکام و سلاطین ہوں یا رعایا۔ ۲۔ مخالف مذہب حکام و سلاطین سے تقیہ کرنا۔ ۳۔ مخالف مذہب فقہاء و قضات سے تقیہ کرنا۔ ۴۔ مخالف مذہب عوام سے تقیہ کرنا۔ ۵۔ شیعہ عوام اور حکام و سلاطین سے تقیہ کرنا۔ ۲۶
- (ج) متقی فیہ (جس چیز میں تقیہ کیا جاتا ہے) کے لحاظ سے تقیہ کی اقسام
 - ۱۔ فعل حرام انجام دینے میں تقیہ کرنا۔ ۲۔ ترک واجب کرنے میں تقیہ کرنا۔ ۳۔ شرط و جزء ترک کرنے میں یا مانع و قاطع انجام دینے میں تقیہ کرنا۔ ۴۔ موضوع خارجی کے مطابق عمل کرنے میں تقیہ کرنا۔ مثلاً جس دن اہل سنت عید مناتے ہیں لیکن شیعہ کے نزدیک (عدم رویت ہلال کی وجہ سے) عید نہ ہو اس دن افطار کرنے میں تقیہ کرنا وغیرہ۔ ۲۷

مستثنیاتِ تقیہ

احکام ثانویہ کے دوسرے قواعد کی مانند قاعدہ تقیہ سے بھی کچھ موارد مستثنیٰ قرار پاتے ہیں۔ فقہاء نے ادلہ تقیہ بالخصوص روایات اور قانون اہم و مهم سے استفادہ کرتے ہوئے جن امور کو قاعدہ تقیہ سے مستثنیٰ کیا ہے اور ان میں تقیہ کو حرام قرار دیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ دین میں فساد کی صورت میں تقیہ حرام ہے۔

جو کام بھی دین میں فتنہ و فساد کا باعث بنے اور جس سے ارکان اسلام کے متزلزل ہونے اور شعائر الہی کے محو ہونے کا خطرہ ہو اس میں تقیہ کرنا حرام ہے۔ مثلاً تقیہ کے طور پر کعبہ اور دوسرے مشاہد شریفہ کو اس طرح تباہ و برباد کرنا کہ ان کا اثر تک باقی نہ رہے یا مذہب کی ایسی تفسیر کرنا کہ جو الحاد کے مطابق ہو تو یہ تقیہ جائز نہیں ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں ہر اس کام میں تقیہ کرنا حرام ہے کہ جس پر عمل کرنا جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت سے زیادہ اہمیت کا حامل ہو۔ یعنی ایسے امور کہ جن کی حفاظت کے لیے جنگ و جہاد اور جان نثاری کرنا واجب ہے۔ البتہ ان موارد کی تشخیص عام آدمی کا کام نہیں بلکہ مجتہد و فقیہ ہی ان کی تشخیص دے سکتا ہے کیونکہ اس کے لیے ادلہ شرعیہ پر تسلط، ذوق شریعت اور تقویٰ و پرہیزگاری ضروری ہے۔

انہی امور میں سے ایک یہ ہے کہ اگر متقی (تقیہ کنندہ) کوئی بڑی، دینی و اجتماعی شخصیت ہو اور اس کے تقیہ کرنے سے مذہب کی توہین ہوتی ہو یا دوسروں کی گمراہی کا اندیشہ ہو تو ایسی شخصیت کے لیے تقیہ کرنا جائز نہیں مثلاً وہ تقیہ کے طور پر بعض محرکات کا ارتکاب کرے (شراب پیئے یا زنا کرے) یا بعض واجبات کو ترک کرے پر مجبور ہو (نماز، روزہ اور حج بجانہ لائے) تو یہاں دلیل رفع یا ادلہ تقیہ سے تمسک کرتے ہوئے تقیہ کا جواز مشکل ہے۔ ۲۸۔ اسی ضمن میں امام خمینی (رہ) لکھتے ہیں:

بروہ چیز کہ جو اصول اسلام یا اصول مذہب میں سے کوئی اصل یا ضروریات دین میں سے کوئی ضرورت ہو اور وہ زوال و تباہی اور تغیر کے خطرے سے دوچار ہو مثلاً بعض منحرفین اور طاغی افراد ارث، طلاق، نماز اور حج جیسے ”اصول احکام“ کو تبدیل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں چہ جائیکہ اصول دین یا اصول مذہب کو تبدیل کرنا چاہیے تو ایسے موقع پر تقیہ جائز نہیں۔ ۲۹۔ مستثنیات تقیہ کے اس مورد پر قاعدہ اہم و مہم کے علاوہ کچھ روایات بھی دلالت کرتی ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔ (عن مسعدة بن صدقة، عن أبي عبد الله عليه السلام في حديث: أن المؤمن إذا أظهر الإيمان ثم ظهر منه ما يدل على نقضه خرج مما وصف وأظهر وكان له ناقضاً إلا أن يدعي أنه إنما عمل ذلك تقية، ومع ذلك ينظر فيه، فإن كان ليس مما يمكن أن تكون التيقية في مثله لم يقبل منه ذلك، لأن للتقية مواضع من أزالها عن مواضعها لم تستقم له وتفسير ما يتقى مثل أن يكون قوم سوء ظاهر حكمهم وفعلهم على غير حكم الحق وفعله، فكل شيء المؤمن بينهم لمكان التقية مما لا يؤدي إلى الفساد في الدين فإنه جائز) ۳۰

”مسعدة بن صدقة نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ اگر اظہار ایمان کے بعد کوئی ایسا کام کرے جس سے ایمان کی نفی ہوتی ہو تو وہ مومنوں کی صف سے نکل جاتا ہے لیکن اگر وہ ادا کرے کہ اس نے یہ کام تقیہ کے طور پر کیا ہے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا اس کام میں تقیہ جائز تھا یا نہیں؟ اگر اس کام میں تقیہ جائز نہیں تھا تو اس کا عذر قبول نہیں ہوگا کیونکہ تقیہ کی حدود معین ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے والا قابل عفو نہیں اور ”ما یتقی“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ایسی بڑی قوم میں پھنسا ہو جو ظالم بھی ہوں اور اس پر غلبہ بھی رکھتے ہوں تو اس صورت میں مؤمن کا بروہ فعل جو تقیہ کی بناء پر ہو اور جس سے دین میں فتنہ و فساد پیدا نہ ہو جائز ہوگا۔“

۲۔ ”عن درست بن أبي منصور قال: كُنْتُ عند أبي الحسن موسى عليه السلام وعنده الكمية بن زيد، فقال للكمية: أنت الذي تقول:

فَالآن صرْتُ إِلَى أُمِّيَّةٍ

وَالْأُمُورُ لَهَا مَصَائِرُ

قال: قلت ذاك والله ما رجعت عن إيماني، وإنيلكم لموالٍ، ولعدوكم لقالٍ، ولكني قلت على التقية، قال: أَمَّا لَنْ قُلْتُ ذلك إني التقية تجوز في شرب الخمر“ ٣١

”درست بن ابی منصور کہتے ہیں: میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا اور کمیت ابن زید (معروف شاعر و مداح اہل بیت) بھی وہاں موجود تھے، امام (ع) نے کمیت (کو سرزنش کرتے ہوئے) فرمایا: کیا (یہ شعر) تم نے کہا ہے؟“ اب میں بنی امیہ کے ساتھ ہوں اور ان کے امور کی برگشت میری جانب ہے۔“

کمیت نے عرض کی: ہاں! میں نے ہی کہا ہے لیکن میں اپنے ایمان سے منحرف نہیں ہوں، میں اب بھی آپ (ع) کا موالی ہوں اور آپ (ع) کے دشمنوں کا دشمن ہوں، لیکن میں نے یہ شعر ”تقیہ“ کے طور پر کہا ہے۔ تب امام (ع) نے اس سے فرمایا: اگر تقیہ ایسے ہی ہونے لگے تو پھر شراب بھی تقیہ کے طور پر جائز ہو جائے۔“

ان دونوں روایات سے جو نکتہ اخذ ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ تقیہ کی کچھ حدود معین ہیں جن کی مراعات ضروری ہے ورنہ تقیہ پر عمل اطاعت کے بجائے نافرمانی شمار ہوگا۔ اس لیے قاعدہ تقیہ کے مجاری کی پہچان اور تشخیص ضروری ہے ورنہ ’کمیت‘ جیسے برجستہ شاعر اور محب اہل بیت (ع) کو بھی ان حدود کی شناخت نہ رکھنے کی وجہ سے امام (ع) وقت کی طرف سے سرزنش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امام کاظم علیہ السلام کی اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے بنی امیہ جیسے ظالموں کی مدح کرنے میں تقیہ جائز نہیں چونکہ ان جیسے لوگوں کی طرفداری کفر کی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور گمراہی و جہالت کو فروغ دینے کا موجب بنتی ہے۔ پس کفر و ضلال کو تقویت پہنچانے والی ہر بات میں تقیہ حرام ہے خواہ وہ ایک شعر کی حد تک ہی کیوں نہ ہو۔

۲۔ شراب خوری، موزوں پر مسح اور متعہ حج میں تقیہ کی حرمت

بعض روایات میں شراب خوری، موزوں پر مسح کرنے اور متعہ حج میں تقیہ حرام قرار دیا گیا ہے۔ چند روایات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) (عن زرارة قال: قلت له: في مسح الخفين تقية؟ فقال: ثلاثة لأتقى فيهن أحداً: شرب المسكر، ومسح

الخفين، ومتعة الحج، قال زرارة: ولم يقل الواجب عليكم أن لا تتقوا فيهن أحداً) ٣٢

زرارة سے منقول ہے کہ میں نے امام (ع) کی خدمت میں عرض کیا: کیا موزوں پر مسح کرنے میں تقیہ ہے؟ آپ (ع) نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جن میں سے کسی میں بھی، میں تقیہ نہیں کرتا۔ نشہ آور چیز (یعنی شراب) میں، موزوں پر مسح کرنے میں اور متعہ حج میں۔ زرارة کہتے ہیں امام (ع) نے یہ نہیں فرمایا: کہ تم پر واجب ہے کہ ان میں سے کسی چیز میں تقیہ نہ کرو۔“

(۲) ایک دوسری جگہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: (والتقية في كل شئ إلا في النبيذ والمسح على

الخفين) ٣٣ ”نہیذ (شراب) اور موزوں پر مسح کے علاوہ ہر چیز میں تقیہ جائز ہے۔“

ان روایات کے مطالعے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان امور میں تقیہ کی حرمت کا فلسفہ کیا ہے اور یہ چیزیں دوسری چیزوں کے ساتھ تقیہ کرنے میں کیوں مختلف حکم رکھتی ہیں؟ بعض محققین نے اس سوال کے جواب میں کچھ توجیہات پیش کی ہیں ٣٤ جو یہ ہیں:

(۱) روایت میں نفی تقیہ سے مراد وہ امور ہیں کہ جن میں زیادہ مشقت نہیں ہوتی یعنی ایسی مشقت کہ جو جان و مال کے خوف کا سبب نہیں بنے۔

(۲) شاید امام (ع) کی مراد یہ ہو کہ میں ان امور میں فتویٰ دینے میں کسی سے تقیہ نہیں کرتا کیونکہ ان امور کی حرمت مخالفین کی مذہب میں بھی واضح و روشن ہے۔

(۳) مذکورہ تینوں امور کے بارے میں اکثر اہل سنت انکار نہیں کرتے کیونکہ وہ متعہ حج، حرمت مسکر اور وضو کے بعد پاؤں دھونے کے لیے جوتے اتارنے کے منکر نہیں ہیں لہذا ان امور میں تقیہ بلاوجہ ہے۔

(۴) کیونکہ ان موارد میں کسی قسم کے ضرر و نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا لہذا تقیہ ضروری نہیں ہے۔

(۵) ان موارد میں ترک تقیہ کی بہترین دلیل قرآن و سنت ہے کیونکہ متعہ حج کے بارے میں قرآن میں حکم موجود ہے ۳۵ اور موزوں پر مسح نہ کر کے صرف پاؤں پر مسح کرنے کے بارے میں بھی قرآن میں صراحت موجود ہے۔ ۳۶ چونکہ پاؤں پر مسح تب ہی ہوگا جب ٹوپی یا موزے اتار کر فقط سر یا پاؤں پر مسح کیا جائے گا۔ ۳۷

(۶) پہلی روایت میں امام (ع) نے ”ثلاثة لا اتقى فيهن احداً“ فرما کر فقط اپنا شخصی حکم بیان کیا ہے۔ چونکہ روایت کے ذیل میں زرارۃ کا یہ جملہ بھی نقل ہوا ہے کہ ”ولم يقل الواجب عليكم أن لاتتقوا فيهن احداً“ ۳۸ لیکن ان تمام توجیہات کے باوجود اگر ضرورت پڑ جائے تو مذکورہ تینوں موارد میں تقیہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اگر جان خطرے میں ہو تو جان کی حفاظت شراب نہ پینے یا موزوں پر مسح نہ کرنے سے زیادہ اہم ہے لہذا یہاں جان کے خوف کی وجہ سے تقیہ جائز ہو جاتا ہے۔ اس بات کی تائید درج ذیل روایت سے بھی ہوتی ہے:

(عن أبي الورد قال: قُلْتُ لأبي جعفر: ”إن أباظبيان حدثني أنه رأى علياً أراق الماء، ثم مسح على الخفين، فقال: كذب أبوظبيان، أما بلغك قول علي عليه السلام فيكم: سبق الكتاب الخفين؟ قُلْتُ: هل فيهما رخصة؟ فقال: لا، إلا من عدو تقية، أو تلج تخاف على رجلك“ ۳۹)

”ابی الورد سے منقول ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ ابوظبیان نے مجھ سے کہا کہ: میں (ابوظبیان) نے علی علیہ السلام کو دیکھا ہے کہ انہوں نے پانی بہا دیا اور موزوں پر مسح کیا، امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: ابوظبیان نے جھوٹ بولا ہے۔ کیا تم نے علی علیہ السلام کا یہ قول نہیں سنا کہ قرآن میں تمہارے لیے خفین کا حکم بیان ہو چکا ہے؟ میں نے عرض کی کیا اس میں رخصت ہے؟ تو آپ (ع) نے فرمایا: نہیں، مگر یہ کہ دشمن سے تقیہ کے طور پر یا پاؤں کو برف سے بچانے کے لیے موزوں پر مسح کرنے کی اجازت ہے۔“

صاحب جواہر بھی مذکورہ بالا احتمالات ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: (لم نعثر على عامل بهذا الرواية أو من استثني ذلك من عمومات التقية) ۴۰

”میں نے کسی کو اس روایت پر عمل کرتے نہیں پایا اور نہ اس مورد کو عموماتِ تقیہ سے استثناء کرتے دیکھا ہے۔“

پس خلاصہ یہی ہے کہ مذکورہ تینوں امور میں زیادہ خوف و خطرہ نہیں ہوتا اس لیے ان میں تقیہ کرنا بے جا ہے

چونکہ تقیہ خوف و خطرے کی صورت میں جان کی حفاظت کے لیے ہے۔ بالفرض ان امور میں بھی جان وغیرہ کا خطرہ ہو تو تقیہ جائز ہو جائے گا اور یہ (تینوں) موارد تقیہ کے مستثنیات میں سے نکل جائیں گے۔

۳۔ قتل میں تقیہ جائز نہیں

یعنی جب بھی انسان کی جان و مال یا عزت و آبرو کسی بے گناہ شخص کے قتل پر موقوف ہو جائے تو یہاں انسان اپنی جان و مال یا عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے تقیہ نہیں کر سکتا اور کسی بے گناہ کو قتل نہیں کر سکتا۔ متعدد روایات اس قسم کے تقیہ کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں منجملہ ایک روایت میں محمد بن مسلم امام باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں:

(إِنَّمَا جَعَلَتِ التَّقِيَّةَ لِيَحْقِنَ بَهَا الدَّمِ، فَيَذَابِلُغَ الدَّمِ فُلَيْسَ تَقِيَّةً) ۴۱

”تقیہ (کا حکم) جان کی حفاظت کے لیے وضع کیا گیا ہے جب یہ خود جان لینے کا سبب بن جائے تو یہاں تقیہ جائز نہیں ہے۔“

نص کے علاوہ فتاویٰ میں بھی اس قسم کے تقیہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ۴۲

۴۔ آئمہ طاہرین (ع) سے اظہارِ برائت میں تقیہ

آئمہ طاہرین بالخصوص امیر المؤمنین علی علیہم السلام سے اظہارِ برائت کرنے میں تقیہ کے جواز و عدم جواز کے بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں جن میں سے بعض عدم جواز پر دلالت کرتی ہیں، بعض رخصت پر دلالت کرتی ہیں اور بعض میں وجوبِ برائت پر دلالت ملتی ہے۔ اظہارِ برائت کے عدم جواز پر دلالت کرنے والی ایک روایت یہ ہے:

(عن محمد بن میمون، عن جعفر بن محمد، عن ابیہ، عن جدہ قال: قال أمير المؤمنين (عليه السلام): يستدعون إلى سبّی فسبوني، وتدعون إلى البراءة مني فمدوا الرقاب، فإني على الفطرة) ۴۳

”محمد بن میمون سے منقول ہے کہ امام جعفر صادق (ع) نے اپنے والد ماجد سے نقل کیا ہے کہ: امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے فرمایا: عنقریب تم کو مجھے بُرا کہنے کے لیے کہا جائے گا، تم مجھے (العیاذ باللہ) بُرا کہہ دینا (پھر) تمہیں مجھ سے اظہارِ برائت کرنے کو کہا جائے گا، تم اپنی گردن کٹا دینا (مگر مجھ سے اظہارِ برائت نہ کرنا) چونکہ میں فطرتِ اسلام پر ہوں۔“

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ”سب“ کرنے میں تقیہ جائز ہے لیکن اظہارِ برائت میں جائز نہیں۔ اسی مضمون کی ایک روایت علی بن الخزاعی نے امام رضا علیہ السلام سے بھی نقل کی ہے۔ ۴۴ اسی طرح بعض دوسرے منابع میں بھی اس قسم کی روایات ملتی ہیں۔ رخصت پر دلالت کرنے والی ایک روایت یہ ہے:

(محمد بن مسعود العیاشی فی (تفسیرہ) عن ابی بکر الحضرمی، عن ابی عبد اللہ (علیہ السلام)۔ فی حدیث۔ أَنَّهُ قِيلَ لَهُ: مَدَّ الرَقَابَ أَحَبَّ إِلَيْكَ أَمَّا الْبَرَاءَةُ مِنْ عَلِيٍّ (علیہ السلام)؛ فَقَالَ: الرِّخْصَةُ أَحَبُّ إِلَيَّ، أَمَا سَمِعْتَ قَوْلَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ فِي عَمَارٍ: ”إِلَّا مَنْ أَكْرَهَ وَ قَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ“ ۴۵

”محمد بن مسعود عیاشی اپنی تفسیر میں ابوبکر حضرمی کے حوالے سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ امام (ع) کی خدمت میں عرض کیا گیا: آپ کو گردن کٹا دینا پسند ہے یا علی علیہ السلام سے اظہارِ برائت کرنا؟ آپ نے فرمایا: مجھے رخصت پسند ہے۔ کیا تم نے عمار کے بارے میں خداوند عزوجل کا یہ قول نہیں سنا: ”مگر وہ شخص جس کو مجبور کیا جائے حالانکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو۔“

وجوب برائت ۴۶ پر دلالت کرنے والی ایک روایت یہ ہے:

(عن مسعدة بن صدقه قال: قلت لأبي عبد الله (عليه السلام): إِنَّ النَّاسَ يَرَوْنَ أَنَّ عَلِيًّا (عليه السلام) قال على منبر الكوفة: أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّكُمْ سَتَدْعُونَ إِلَى سَبِّفَسْبُونِي، ثم تدعون إلى البراءة مِنِّي فلا تَبْرؤُوا مِنِّي، فقال: مَا أَكْثَرَ مَا يَكْذِبُ النَّاسُ عَلَى عَلِيٍّ (عليه السلام) ثم قال: إِنَّكُمْ سَتَدْعُونَ إِلَى سَبِّفَسْبُونِي، ثم تدعون إلى البراءة مِنِّي وَإِنِّي لَعَلِّي دين محمد (صلى الله عليه وآله) ولم يقل: وَلَا تَبْرؤُوا مِنِّي، فقال له السائل: أَرَأَيْتَ أَنْ أَخْتَارَ الْقَتْلَ دُونَ الْبَرَاءَةِ، فقال: وَاللَّهِ مَا ذَلِكَ عَلَيْهِ وَمَالَهُ إِلَّا مَا مَضَى عَلَيْهِ عَمَارِ بْنِ يَاسِرٍ حَيْثُ أَكْرَهَ أَهْلَ مَكَّةَ وَقَلْبَهُ مَطْمَئِنُّ بِالْإِيمَانِ، فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ فِيهِ "إِلَّا مَن أَكْرَهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ" فقال له النَّبِيُّ (ص) عِنْدَهَا: يَا عَمَارُ إِنَّ عَادُوا فَعَدَّ، فَقَدْ أَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ وَأَمَرَكَ أَنْ تَعْدِدَ (عَادُوا) ۴۷

”مسعدة بن صدقه سے منقول ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کی: لوگ کہتے ہیں کہ: علی علیہ السلام نے منبر کوفہ سے اپنے خطاب میں فرمایا: اے لوگو! عنقریب تم کو مجھ پر سب و شتم کرنے پر مجبور کیا جائے گا تو اس وقت تم مجھ پر سب و شتم کر سکتے ہو۔ پھر تمہیں مجھ سے اظہار برائت کے لیے کہا جائے گا، تم مجھ سے اظہار برائت نہ کرنا۔۔۔ اس پر امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: لوگ علی علیہ السلام کے بارے میں کس قدر جھوٹ بولتے ہیں۔ حالانکہ علی علیہ السلام نے یوں فرمایا تھا: ”تمہیں مجھ پر سب و شتم کرنے کے لیے کہا جائے گا تو کر دینا۔ پھر اظہار برائت کے لیے کہا جائے گا تو یاد رکھو میں دین محمد (صلى الله عليه وآله وسلم) پر ہوں۔ آپ (ع) نے یہ نہیں فرمایا: ”مجھ سے اظہار برائت نہ کرنا۔“ اس پر سائل نے (امام صادق علیہ السلام سے) عرض کی: کیا آپ (ع) فرماتے ہیں کہ میں اظہار برائت کے بجائے قتل ہو جاؤں؟ تو آپ (ع) نے فرمایا: ”حضرت علی علیہ السلام کی مراد یہ نہیں، اس سے مراد عمار بن یاسر کا طریقہ ہے جو انہوں نے کفار مکہ کے مجبور کرنے پر اختیار کیا تھا، جبکہ ان کا دل ایمان سے مطمئن تھا۔ جس پر خداوند متعال یہ آیت نازل فرمائی ”مگر وہ شخص جس کو مجبور کیا جائے حالانکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو“، تو رسول خدا (ص) نے عمار سے فرمایا: اے عمار! اگر وہ لوگ دوبارہ مجبور کریں تو تم پھر وہی کرو، خداوند نے تیرے عذر سے مجھے آگاہ کر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اگر وہ تمہیں پھر مجبور کریں تو وہی طریقہ اختیار کرو۔“

اس حدیث میں امام صادق علیہ السلام نے حضرت عمار کے قصہ سے استشہاد کر کے وجوب تقیہ کی نفی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہاں تقیہ کرنا حرام نہیں بلکہ تقیہ کے طور پر برائت کی جاسکتی ہے۔ آئمہ طاہرین (ع) سے تقیہ کے طور پر اظہار برائت کے جواز و عدم جواز کے متعلق منقول روایات میں بظاہر تضاد و تناقض نظر آتا ہے اور یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ اظہار برائت کا مسئلہ مستثنیات تقیہ میں سے ہے یا نہیں؟ لیکن اگر ان روایات کو سند و متن کے لحاظ سے زمان و مکان کے [پتقاضوں اور متقی (تقیہ کنندہ) افراد کی شخصیت و اجتماعی حیثیت کے اعتبار سے عقل و درایت کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو ان کا تضاد و تناقض ختم ہو جاتا ہے اور ان روایات میں ایک قسم کا ارتباط و نظم برقرار ہو جاتا ہے۔ لہذا اس قسم کی روایات کو دقیق طور پر سمجھنے کے لیے چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے۔

آئمہ طاہرین (ع) کے فرمودات کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ یہ حضرات (ع) زمان و مکان کے تقاضوں اور مخاطبین کے ایمانی درجات فہم و شعور اور صبر و استقامت کو مدنظر رکھ کر کوئی حکم صادر فرماتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایات میں ایک موضوع کے بارے میں مختلف حکم ملتے ہیں۔ اس کا فلسفہ یہی تھا کہ آئمہ اطہار (ع) مخاطب کی شخصیت، فہم، شعور اور زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق حکم اولی و حکم ثانوی بیان فرماتے تھے چونکہ امام معصوم سے زیادہ کون حکم اولی و حکم ثانوی کے موقع و محل کی تشخیص کر سکتا ہے۔ اسی

لیے آئمہ اطہار (ع) بالخصوص امیر المؤمنین علی علیہم السلام سے اظہار برائت کے بارے میں تقیہ کرنے کے جواز و عدم جواز کا حکم بھی مختلف ملتا ہے چونکہ آئمہ طاہرین (ع) کے مخاطبین نہ صرف اپنے زمانے کے لوگ تھے بلکہ اپنے علم لدنی کی وجہ سے وہ آئندہ زمانے کے حالات کو بھی حکم بیان کرتے وقت مدنظر رکھتے تھے۔ چونکہ اظہار برائت کو مسئلہ ہر زمانے میں اور ہر قسم کے اشخاص کو پیش آسکتا ہے۔ لہذا روایات میں ان سب چیزوں کو مدنظر رکھ کے حکم دیا گیا ہے چونکہ تقیہ کا فلسفہ نہ فقط مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اساس دین و مذہب کی حفاظت بھی ہے۔ ہوسکتا ہے ایک وقت اظہار برائت کرنے سے پورے دین و مذہب کی اساس ہی خراب ہو جائے اور ایک وقت اظہار برائت نہ کرنے سے دین پر تو کوئی حرف نہ آئے لیکن کئی قیمتی جانیں بغیر کسی اہم فائدے کے ضائع ہو جائیں اس مسئلہ کو اگر تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس مسئلہ کا فہم آسان ہو جاتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب بنی امیہ و بنی عباس جیسے دشمنان اسلام اپنے دینوی اقتدار کی خاطر رسول اسلام (ص) کے حقیقی جانشینوں یعنی آئمہ طاہرین (ع) کے نام و نشان کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے اور مختلف حیلوں بہانوں سے امت اسلام کو ان ذوات مقدسہ سے دور رکھنے کے لیے اہل بیت (ع) سے اظہار برائت پر مجبور کرتے تھے ایسے حالات میں ان ذوات قدسیہ سے اظہار برائت کے سلسلے میں تقیہ کرنا اور آئمہ اہل بیت (ع) کے مذہب و مشن سے اظہار برائت کرنا، دشمنوں کے اہداف کی تکمیل کے مترادف تھا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آئمہ معصومین علیہ السلام کے باوفا اصحاب اور ساتھیوں میں سے کوئی بھی شخص ایسا نظر نہیں آتا جس نے آئمہ سے برائت کا اظہار کیا ہو یا اس سلسلے میں تقیہ جیسی رخصت سے استفادہ کیا ہو، سوائے یہ کہ خود آئمہ (ع) نے اسے اس کام پر مأمور کیا ہو چنانچہ حجر بن عدی، میثم تمار، عمرو ابن الحمق، عبد اللہ بن عقیف، سعید بن جبیر رضوان اللہ علیہم نے فقط آئمہ اہل بیت (ع) سے اپنا قوی ارتباط برقرار رکھنے کے جرم میں اپنی جانیں قربان کر ڈالیں اور کسی بھی مقام پر تقیہ کو سپر بناتے ہوئے آئمہ (ع) سے اظہار برائت نہیں کیا چونکہ یہ لوگ مکتب اہل بیت (ع) کے پرورش یافتہ تھے اور تعلیمات اہل بیت (ع) سے مکمل طور پر آگاہ ہونے کی وجہ سے حکم اولی و حکم ثانوی کی بہتر تشخیص دے سکتے تھے لہذا ان مقدس و متشرع افراد کی سیرت ایسے نازک و حساس موقعوں پر ترک تقیہ کے رجحان پر بہترین دلیل ہے اور آئمہ معصومین (ع) کی ان روایات کی تائید کرتی ہے کہ جن میں اظہار برائت میں ترک تقیہ کا حکم ملتا ہے۔

اس کے مقابلے میں ایک ایسا زمانہ ہے کہ جس میں آئمہ طاہرین علیہ السلام سے اظہار برائت کرنے یا نہ کرنے سے کسی دینی و مذہبی اساس پر خدشہ وارد ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا یا اظہار برائت پر مجبور ہونے والے افراد بھی کسی قسم کی دینی و مذہبی شخصیت کے حامل نہیں ہیں یعنی عام لوگ ہیں اور ان کے کسی قول و فعل سے اساس دین و مذہب کے بگڑنے کا اندیشہ نہیں ہے اس صورت میں ان عام مؤمنین کی جانیں اگر آئمہ معصومین (ع) سے ظاہری ارتباط کٹ جانے یا اظہار عقیدہ نہ کرنے کی وجہ سے محفوظ رہ جاتی ہیں تو اس کے لیے تقیہ کرنا یقیناً عقل و شرع کے مطابق ہوگا۔ بالفرض اگر وہ اپنے جذبات و احساسات کے تحت تاثیر آئمہ اطہار (ع) سے اظہار عقیدت کرنے کی وجہ سے اپنی اور دوسرے مؤمنین کی جانوں کو خطرے میں ڈالتے ہیں اور ان کے اس عمل سے بلا وجہ جانوں کے تلف ہو جانے کے سوا اور کوئی عقلی فائدہ حاصل نہیں ہوتا تو یہاں آیہ مجیدہ ”لَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“ ۲۸ کی مخالفت کے سبب ان کا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا خلاف عقل و شرع محسوب ہوگا۔ لہذا تقیہ کے وجوب و عدم وجوب میں موقع و محل کی تشخیص اور تقیہ کرنے والے افراد کی موقعیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیے فقہاء نے تقیہ کو احکام خمسہ (واجب، مستحب، مکروہ، حرام اور مباح) میں تقسیم کیا ہے۔ ہمارے اس بیان کی تائید روایات سے بھی ہوتی ہے چنانچہ ایک روایت ہے کہ:

(عن محمد بن مروان قال: قال لي أبو عبد الله عليه السلام: ما منع ميثم رحمه الله من التقية؟ فوالله لقد علم إن هذه الآية في عمار وأصحابه: "إِلَّا مَن أكره وقلبه مطمئن بالإيمان" ٤٩)

”محمد بن مروان سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا: میثم پر خدا رحمت کرے اس کو کس چیز نے تقیہ سے روکا ہے؟ خدا کی قسم! وہ جانتا تھا کہ یہ آیت ”إِلَّا مَن أكره وقلبه مطمئن بالإيمان“ عمار اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔“

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ امام (ع)، میثم کی موقعیت اور عمار کی موقعیت میں فرق بتانا چاہتے ہیں یعنی حضرت میثم، حضرت عمار کے بارے میں نازل ہونے والی آیت سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ اکراہ کی صورت میں تقیہ کا حکم بھی موجود ہے لیکن وہ آئمہ اطہار (ع) سے اپنی غیر معمولی وابستگی اور اپنے زمانے کے تقاضوں کا ادراک رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ عمار کے زمانے میں اور میرے زمانے میں فرق ہے عمار کے زمانے میں مؤمنین کی تعداد انتہائی کم تھی ایک مؤمن کا فقدان بھی اسلام کے لیے غیر معمولی نقصان تھا لہذا کفار و مشرکین کے مقابلے میں تقیہ کرنا ہی ان کا فریضہ تھا جبکہ بنی امیہ کے مقابلے میں آئمہ اطہار (ع) سے اظہار عقیدت میرے جیسے شخص کا فریضہ ہے۔ پس انہوں نے اپنے بلند مقام و مرتبہ کے ساتھ قتل ہو جانے کو ترجیح دی اور آئمہ (ع) سے برائت کرنے میں تقیہ نہیں کیا۔ اس روایت سے موارد تقیہ میں فرق بھی واضح ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات ترک تقیہ رجحان رکھتا ہے۔

مذکورہ بالا وضاحت سے پتہ چلتا ہے کہ تقیہ کے دوسرے موارد کی طرح اظہار برائت کے سلسلے میں بھی تقیہ کرنے یا نہ کرنے میں زمان و مکان اور متقی (تقیہ کنندہ) افراد کی موقعیت کو گہرا دخل حاصل ہے۔ پس یہ مسئلہ فقط بنی امیہ و بنی عباس کے دور سے ہی مختص نہیں بلکہ آج کے زمانے میں بھی اظہار برائت کے سلسلے میں تقیہ کے موارد کی تشخیص ضروری ہے بالخصوص ہمارے ملک میں انقلاب اسلامی کے بعد جو حالات پیدا ہو چکے ہیں اور دشمنان اسلام اہل بیت اطہار (ع) سے اظہار عقیدت و موَدّت کے جو اثرات دیکھ چکے ہیں جن کے بعد وہ ان ذوات مقدسہ کی عقیدت اور موَدّت کو مسلمانوں کے دلوں سے نکالنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور اہل بیت (ع) سے اظہار برائت کروانے کے لیے قلم و بیان جیسے سرد ہتھیاروں سے لیکر کلاشنکوفوں جیسے گرم ہتھیاروں تک استعمال کر رہے ہیں ایسے موقع پر اگر کوئی بلند پایہ مذہبی و دینی شخصیت اہل بیت اطہار (ع) سے اظہار برائت کرنے یا اس سے ملتا جلتا کوئی فعل انجام دینے پر مجبور کی جاتی ہے تو یہاں اس کا وہی فریضہ ہے جس پر حجر بن عدی و میثم تمار جیسے بزرگوں نے عمل کیا تھا اور تقیہ ترک کرتے ہوئے اپنی جانوں کے بدلے عقیدت و موَدّت اہل بیت (ع) کے نوخیز پودے کو پروان چڑھایا تھا اگر اس سلسلے میں یہ مذہبی و دینی شخصیت تقیہ کو بہانہ بنا کر کسی قسم کی کوتاہی کا مظاہرہ کرتی ہے تو یہ اس کا اپنے فرائض سے فرار اور آئمہ اہل بیت (ع) کے مشن سے جنایت کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا جبکہ اس کے مقابلے میں عام لوگوں کو فریضہ یہی ہے کہ وہ بغیر کسی عقلی فائدے کے اپنی اور دوسرے مؤمن کی جانوں کو تلف ہونے سے بچائیں اور ایسا کوئی جذباتی قدم نہ اٹھائیں جس کا نتیجہ قیمتی جانوں کے تلف ہونے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ پس اظہار برائت کے سلسلے میں منقول روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بعض موارد میں یہ روایات اظہار برائت کو مستثنیات تقیہ میں سے قرار دیتی ہیں اور بعض دوسرے موارد میں اظہار برائت مستثنیات تقیہ میں سے نہیں ہوگا بلکہ وہاں تقیہ کرنا ہی فریضہ قرار پائے گا۔

امام حسین علیہ السلام کا تقیہ نہ کرنا

اس تمہید کے بعد اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں وہ یہ کہ میدان کر بلا میں امام حسین علیہ السلام نے تقیہ کیوں نہیں کیا اگر امام عالی مقام (ع) تقیہ کر لیتے تو شاید عالم اسلام کو یہ واقعہ پیش نہ آتا؛ یہ وہ شبہ یا سوال ہے کہ جو مخالفین کے علاوہ خود پیروان اہل بیت کے اذہان میں بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ چونکہ ائمہ اطہار (ع) نے تقیہ کی بہت زیادہ تاکید کی ہے۔ تقیہ کے بارے میں گذشتہ صفحات میں تمہید کے طور پر جو مفصل وضاحت پیش کی گئی ہے اس کی روشنی میں امام حسین (ع) کے تقیہ نہ کرنے کے بارے میں چند نکات پیش کیئے جاتے ہیں:

۱۔ قانون تقیہ کافلسفہ جہاں مؤمنین کی جان و مال اور عزت و آبرو کو بلاوجہ تلف ہونے سے بچانا ہے وہاں دین اسلام کی حفاظت کرنا بھی ہے۔ اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ دین اسلام کی حفاظت اہم ترین واجبات میں سے ہے اور کبھی ایسی صورت حال پیدا ہوجاتی ہے کہ جس میں دین و مذہب پر جان و مال اور عزت و آبرو تک قربان کرنا واجب ہوجاتا ہے اور دین کا محفوظ رہنا، جان کی بازی لگادینے پر موقوف ہوجاتا ہے۔ ایسے حالات میں ایک خالص اور سچا مؤمن کسی قسم کی مصلحت اندیشی نہیں کرتا چہ جائیکہ امام معصوم (ع) کہ جس کا فریضہ ہی دین و مذہب کی حفاظت کرنا ہے۔ اسی لیے تقیہ کو احکام پنجگانہ میں تقسیم کیا جاتا ہے یعنی کبھی تقیہ واجب ہوجاتا ہے اور کبھی حرام، کبھی مستحب اور کبھی مکروہ اور کبھی مباح۔ مستثنیات تقیہ میں بھی واضح کیا جاچکا ہے کہ تقیہ اگر انہدام دین کا باعث بن رہا ہو تو وہاں حرام ہوجاتا ہے۔ پس تعلیمات دین اور ارکان اسلام کی حفاظت کے لیے کبھی تقیہ کرنا واجب ہوتا ہے اور کبھی تقیہ نہ کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ مقصد، دین کی حفاظت ہے خواہ تقیہ کرنے سے انجام پائے خواہ ترک تقیہ سے۔ اسی طرح تقیہ مؤمنین کی جان و مال کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے لیکن اگر تقیہ کرنے سے مؤمنین کی جان وغیرہ توبچ جائے مگر مذہب و دین پر حرف آئے تو یہاں ترک تقیہ ضروری ہوجاتا ہے۔

۲۔ مسئلہ تقیہ میں مجاری تقیہ کی شناخت ضروری ہے یعنی تقیہ کرنے والے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسے کہاں تقیہ کرنا ہے اور کہاں تقیہ نہیں کرنا۔ تقیہ کے موارد و مجاری سے آگاہی ایک ضروری امر ہے۔ ہوسکتا ہے عام لوگ تقیہ کے موارد کی درست پہچان نہ رکھتے ہوں اور اپنی کم علمی کی بناء پر جہاں تقیہ کرنا چاہیے وہاں تقیہ ترک کردیں اور جہاں ترک تقیہ ضروری ہے وہاں تقیہ کرنے لگیں اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق اور زندگی کے نشیب و فراز میں صحیح راہ اپنانا اکثر لوگوں کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: **عَلَى الْعَاقِلِ أَنْ يَكُونَ عَارِفًا بِزَمَانِهِ مُقْبِلًا عَلَى شَأْنِهِ** ۵۰ ”عاقل انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے زمانے کو پہچانے اور اپنے فریضہ پر عمل کرے۔“

حقیقی مؤمن کی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے زمانے سے آگاہ ہوتا ہے وہ زندگی کے نشیب و فراز کو طے کرنا جانتا ہے اسے دنیا دہوکہ نہیں دے سکتی وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، دین اسلام کے احکام کو جاری کرتا ہے چونکہ دین اسلام ہر زمانے کے لیے ہے پس مؤمن کو بھی چاہیے کہ وہ ہر دور میں دین اسلام پر عمل کرے مگر یہ کام وہی کرسکتا ہے جو احکام دین سے آگاہ ہو اور ”تفقه فی الدین“ کی صفت سے متصف ہو۔ اگر ایک مؤمن کے لیے یہ سب باتیں ضروری ہیں تو کیا امام معصوم (ع) کو ان صفات کا حامل نہیں ہونا چاہیے؟ اور اپنے زمانے کے تقاضوں سے آگاہ نہیں ہونا چاہیے؟ یقیناً امام معصوم (ع) وہ بھی حضرت سید الشهداء امام حسین علیہ السلام جیسی ہستی، اپنے زمانے کے تقاضوں سے بھی پوری طرح آگاہ تھی اور احکام اسلام سے بھی مکمل طور پر مطلع تھی۔ امام عالی

مقام (ع) جانتے تھے کہ کہاں تقیہ کرنا چاہیے اور کہاں تقیہ کے بجائے جان قربان کرنی چاہیے اور یہ بات ہر وہ مسلمان جانتا ہے کہ جو امام حسین علیہ السلام کے مقام و مرتبے سے آگاہ ہے۔ یہی صفات عالیہ تھیں کہ جن کی وجہ سے اپنے دونوں نواسوں کے بارے میں پیغمبر اکرم (ص) نے فرمایا: ”الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَ هُمَا إِمَامَانِ قَامَا أَوْفَعِدَا“ ۵۱

یعنی ”حسن ا ورحسین (ع) جوانان اہل جنت کے سردار ہیں اور وہ ہر دو امام (ورہبر) ہیں خواہ حالت قیام میں ہوں یا حالت قعود میں۔“

رسول خد (ص) کا برسوں پہلے، ان دو اماموں کے بارے میں اس طرح کی وصیت کرنا اسلام میں ان کی عظمت اور قابل اقتداء ہونے کی دلیل ہے۔ یعنی رسول خد (ص) اُمت کو وصیت فرما رہے ہیں کہ حسن و حسین علیہما السلام جس حالت میں بھی ہوں، قابل اقتداء ہیں اور ان کی پیروی کرنی ضروری ہے، خواہ وہ کسی کے ساتھ صلح کی حالت میں ہو یا جنگ کی حالت میں۔ کیونکہ وہ احکام دین سے بھی آگاہ ہیں اور زمان و مکان کے تقاضوں کو بھی دوسروں کی نسبت بہتر جانتے ہیں۔ پس اگر امام حسن علیہ السلام، زمانہ معاویہ میں تقیہ کو اپناتے ہوئے اس سے صلح کر لیتے ہیں تو اس میں بھی دین اسلام کی حفاظت امام (ع) کے مدنظر تھی اور اگر امام حسین علیہ السلام یزید کے مقابلے میں تقیہ ترک کر کے اعلان جنگ فرماتے تو یہ بھی دین کی حفاظت کے لیے تھا ورنہ یہی امام حسین (ع) زمانہ معاویہ میں کئی برس، تقیہ کی حالت میں گزارتے ہیں اور معاویہ کے خلاف قیام نہیں فرماتے کیونکہ امام (ع) کی نظر میں معاویہ اور یزید کا زمانہ مختلف تھا اور ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق احکام اسلام پر عمل کیا جاتا ہے۔

تاریخ مسلمین کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یزید کا دور مسلمانوں کی تاریخ میں ایک استثنائی دور تھا۔ ایسا دور کہ جس میں دین اسلام کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں۔ یزید تمام احکام اسلام کو پائمال کر رہا تھا۔ شراب نوشی، عیاشی اور کتوں اور بندروں سے کھیلنا، مکہ معظمہ و مدینہ منورہ پر حملہ کرنا، مدینہ منورہ میں قتل و غارت یہ سب یزید کے کارنامے تھے کہ جن سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ ایسی حالت میں کوئی بھی حقیقی مؤمن خاموشی اختیار نہیں کر سکتا تھا، چہ جائیکہ امام حسین علیہ السلام جیسی ہستی کہ جو خود محافظ دین تھے وہ کیسے احکام دین کو اس طرح پائمال ہوتا دیکھتے۔ گوکہ یزید کے لیے یہ سب مقدمات اس کے باپ معاویہ نے فراہم کیئے تھے لیکن وہ خود زیرک تھا، کھلے عام احکام اسلام کی خلاف ورزی نہیں کرتا تھا اور محافظین دین کو اپنے خلاف قیام کرنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ اس نے یزید کو بھی یہی وصیت کی تھی کہ کھلے عام احکام دین کی توہین نہ کرنا، فلاں فلاں بزرگان دین سے نہ ٹکرانا، سیاست سے کام لینا لیکن یزید اس قدر عیاش، بے دین اور لالبا لی تھا کہ اس نے اقتدار کی کرسی پر قدم رکھتے ہی دین اسلام کی جڑیں اکھاڑنی شروع کر دیں۔ اگر یزید کو اس طرح کھلی چھٹی دے دی جاتی تو آج نہ توروئے زمین پر احکام اسلام باقی رہتے اور نہ ہی کوئی سچا مسلمان باقی رہتا۔

اس کے علاوہ یزید، امام حسین علیہ السلام کو اپنی بیعت کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ یعنی وہ چاہتا تھا کہ امام عالی مقام (ع) اس کی بیعت کر کے اس کے تمام غیر شرعی کاموں پر مہر تصدیق ثبت کر دیں۔ کیا ایسے حالات میں، امام علیہ السلام خاموش رہتے اور تقیہ کے بہانے دین کی ہر پائمالی کو دیکھتے رہتے، جبکہ یہ سب حسین (ع) بن علی (ع) جیسی ہستی سے بعید تھا اور پھر یزید نے امام حسین علیہ السلام کی موت و حیات کو اپنی بیعت میں منحصر کر دیا تھا لیکن امام (ع) نے اس کے جواب میں فرمایا:

”وَمِثْلِي لَا يُبَايِعُ مِثْلَهُ“ ۵۲ یعنی ”مجھ جیسا، اس جیسے کی بیعت نہیں کرتا۔“

پس امام علیہ السلام کا ایک ہی فیصلہ تھا کہ میں نے یزید کی بیعت نہیں کرنی چونکہ اس بیعت کا مطلب، تمام احکام دین کی پائمالی کو قبول کرنا ہے اور امام معصوم (ع) مفترض الطاعة کا یزید جیسے خلیفہ کی بیعت کرنے سے اسلام کا مٹ جانا یقینی تھا۔ اور جہاں یقین ہو جائے کہ ترک تقیہ سے اسلام مٹ جائے گا تو وہاں تقیہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے! وہ بھی امام معصوم (ع) کے لیے۔

۴۔ ان سب باتوں کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السلام جانتے تھے کہ اس معرکہ حق و باطل میں میری قربانی، مطلوب خداوند ہے اور یہ تقدیر الہی ہے کہ حق و حقیقت کے لیے ایک مقدس ترین ہستی اپنی جان کا نذرانہ پیش کرے اور پھر بہت سی احادیث نبوی (ص) میں بھی امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور بنی امیہ کی طغیانی کی پیش گوئی کی گئی تھی اور یہ ایک ایسی واقعیت تھی کہ جس کو خود امام حسین علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

”إِنَّ اللَّهَ شَاءَ أَنْ يَرَانِي قَتِيلًا وَأَنْ يَرَاهُنَّ سَبَايَا“ ۵۳ یعنی ”بتحقیق خداوند مجھے مقتول دیکھنا چاہتا ہے اور انہیں (مخدرات عصمت کو) اسیر۔“

پس امام حسین علیہ السلام دین اسلام کی سربلندی اور حفاظت کے لیے تقدیر الہی کے اس فیصلے سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ فقط میری قربانی سے ہی اسلام بچ سکتا ہے جب ایک شجاع شخص ایسے حالات سے دوچار ہو جائے تو اس کے لیے موت کوئی معنی نہیں رکھتی اور وہاں تقیہ جیسے مفہیم اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔ لہذا علم امام (ع) اور واقعہ کربلا کے بارے میں پیغمبر اسلام (ص) کے فرمودات کے بعد ترک تقیہ ہی بہترین راستہ تھا۔

۵۔ بالفرض، یہاں ہم تقیہ کو رخصت شرعی کے معنی میں بھی لیں تو بھی امام حسین علیہ السلام جیسی ہستی کہ جو ایثار و قربانی اور شجاعت و دلیری کا نمونہ ہے، رخصت کے بجائے شہادت ہی کو ترجیح دیتی کیونکہ امام عالی مقام (ع) نے وہی راستہ اپنانا تھا جو خداوند کے نزدیک زیادہ محبوب تھا اور آپ (ع) نے اسی فریضہ پر عمل کرنا تھا جو خدا کے نزدیک زیادہ فضیلت کا حامل تھا چونکہ رسول خدا (ص) کا فرمان ہے: ”أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ أَحْمَضُهَا“ یعنی خداوند کے نزدیک افضل ترین کام وہ ہے جو زیادہ سخت ہے اور پھر امام (ع) خداوند کے فرمان: (فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا) ۵۴ سے بھی آگاہ تھے اور فضیلت جہاد کو جانتے تھے لہذا ایسے حالات میں کہ جن میں اس وقت دنیائے اسلام گرفتار ہو چکی تھی، جہاد کرنا اور خدا کی راہ میں شہید ہو جانا ہی امام حسین علیہ السلام کے لیے زیادہ پسندیدہ تھا نہ کہ تقیہ جیسی رخصت شرعی پر عمل کرنا اور پھر امام عالی مقام (ع) نے ایسا ہی کیا اور قیام و شہادت کو تقیہ پر ترجیح دے کر ہمیشہ کے لیے اسلام کے سچے پیروکاروں کا راستہ معین کر دیا کہ جب بھی احکام دین پر حرف آئے تو شرعی رخصت کے بجائے شہادت و فداکاری کا راستہ اپنانا زیادہ فضیلت رکھتا ہے کیونکہ رسول اکرم (ص) کا فرمان ہے: (إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ أَنْ يُؤْخَذَ بِرُخْصَةٍ كَمَا يُحِبُّ أَنْ يُؤْخَذَ بِعَزَائِمِهِ) ۵۵ یعنی ”بتحقیق خداوند جس طرح اپنی رخصتوں پر عمل کو پسند فرماتا ہے اسی طرح اپنے قطعی احکام پر عمل کو بھی پسند کرتا ہے۔“

حواله جات :

- (۱) الصحاح، (اسماعيل بن حماد جوهرى)، ماده وقى.
- (۲) كتاب المكاسب، ج ۳، ص ۱۲۷ (رسالة فى التقيه)
- (۳) مؤمن (غافر)، آيت ۴۵.
- (۴) آل عمران، آيت ۲۸.
- (۵) مجمع البيان، سوره آل عمران ذيل آيه ۲۸.
- (۶) تصحيح الاعتقاد الاماميه، ص ۱۳۷.
- (۷) كتاب المكاسب، ج ۳، ص ۱۲۷ (رسالة فى التقيه).
- (۸) مجمع البيان، ج ۲، ص ۷۲۹.
- (۹) التبيان، ج ۲، ص ۴۳۴.
- (۱۰) القاعدة الفقهية الاماميه، ص ۱.
- (۱۱) التفسير الكبير، ج ۸، ص ۱۲.
- (۱۲) فرهنگ اصطلاحات فقهى، ص ۱۴.
- (۱۳) اصطلاحات الاصول، ص ۱۲۱.
- (۱۴) حكم ثانوى در تشريع اسلامى، ص ۲۰۶.
- (۱۵) وسائل الشيعه، ج ۱۶، ص ۲۱۲، باب امر بالمعروف ونهى عن المنكر، باب ۲۵، ح ۲.
- (۱۶) كتاب المكاسب، ج ۳ (رسالة فى التقيه)، ص ۱۲۹.
- (۱۷) القواعد والفوائد، ج ۲، ص ۱۸.
- (۱۸) ايضاً
- (۱۹) تفسير الكبير، ج ۸، ص ۱۲.
- (۲۰) وسائل الشيعه، ج ۱۶، ص ۲۲۲، كتاب امرونى، باب ۲۸، ح ۳.
- (۲۱) الرسائل العشره (التقيه)، ص ۳۴.
- (۲۲) اصول كافى، ج ۲، ص ۱۲۳، كتاب ايمان و كفر، باب المدارا، ح ۴.
- (۲۳) ايضاً، ح ۴.
- (۲۴) وسائل الشيعه، ج ۱۶، ص ۲۰۷، كتاب امرونى، باب ۲۴، ح ۱۴.
- (۲۵) سوره آل عمران، آيت ۱۰۳.
- (۲۶) الرسائل العشره (التقيه)، ص ۸.
- (۲۷) الرسائل العشره، ص ۹.
- (۲۸) الرسائل العشره، ص ۱۳.
- (۲۹) ايضاً، ص ۱۴.
- (۳۰) وسائل الشيعه، ج ۱۶، ص ۲۱۶، كتاب امرونى، باب ۲۵، ح ۶.
- (۳۱) ايضاً، ح ۷.
- (۳۲) ايضاً، ح ۵.
- (۳۳) ايضاً، ح ۳.
- (۳۴) جوابر الكلام، ج ۲، ص ۲۳۷.
- (۳۵) ديكهئى سوره بقره، آيت ۱۹۶.
- (۳۶) ديكهئى سوره بقره، آيت ۶.
- (۳۷) تقيه سپرى براى مبارزه عميق تر،

- (٣٨) جواهر الكلام، ج٢، ص٢٣٤، مرآة العقول، ج٩، ص١٦٤.
- (٣٩) وسائل الشيعة، ج١، كتاب الطهارة، ابواب وضوء، باب ٣٨، ح٥.
- (٤٠) جواهر الكلام، ج٢، ص٢٣٤.
- (٤١) وسائل الشيعة، ج١٦، ص٢٣٢، كتاب امروني، باب ٣١، ح١.
- (٤٢) السرائر، ج٢، ص٢٥. جواهر الكلام، ج٢٢، ص١٦٩.
- (٤٣) وسائل الشيعة، ج١٦، ص٢٢٨، كتاب امروني، باب ٢٩، ح٨.
- (٤٤) ايضاً، ج٩.
- (٤٥) ايضاً، ج١٢.
- (٤٦) الرسائل العشرة (رسالة في التقيه)، ص٢٨.
- (٤٧) وسائل الشيعة، ج١٦، ص٢٢٩، كتاب امروني، باب ٢٩، ح٢.
- (٤٨) سورة بقره، آيت ١٩٥.
- (٤٩) وسائل الشيعة، ج١٦، ص٢٢٦، كتاب امروني، باب ٢٩، ح٣.
- (٥٠) بحار الانوار، ج٥، ص٢٤٢ (طبع قديم).
- (٥١) بحار الانوار، ج٤٣، ص٢٦٥.
- (٥٢) سخنان حسين بن علي (ع) از مدينه تا كربلا، ص١٢٢.
- (٥٣) ايضاً، ص٨٩.
- (٥٤) سورة نساء، آيت ٩٥.
- (٥٥) وسائل الشيعة، ج١١، ص٢٨١.